آب حیات کے لطیفے

ایک روپیہ آٹھ آنے

پبلشرز۔ اظہر نگرامی ۔ کتابی دنیا لکھنؤ
پرنٹرز۔ یونائٹڈ انڈیا پریس لکھنؤ

آبِ حیات کے لطیفے

محمد حسین آزاد

مرتبہ

حسین علوی

کتابی دنیا ——— لکھنؤ

غالب

اسد اللہ خاں نام۔ غالب تخلص۔ مرزا نوشہ لقب ۱۷۹۶ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ مرزا صاحب کی زندگی دہلی میں گزری۔ استاذوق کے انتقال کے بہادر شاہ ظفر نے انھیں کو اپنا کلام دکھایا۔ ۱۸۶۹ء دہلی میں وفات پائی۔

غالب

ایک قدیمی شاگرد سے مرزا غالب سے بے تکلفی تھی۔ اس نے امراؤ سنگھ نامی ایک اور شاگرد کی بی بی کے مرنے کا حال مرزا صاحب کو لکھا۔ اور یہ بھی لکھا کہ ننھے ننھے بچے ہیں اور اب شادی نہ کرے تو کیا کرے؟ پھر بچے کون پالے؟ اس شخص کی ایک بی بی پہلے مر چکی تھی اور یہ دوسری بی بی مری تھی۔ اب حضرت اس کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں امراؤ سنگھ کے حال پر اس کے واسطے رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے۔ اللہ اللہ ایک وہ ہیں کہ دو بار بیڑیاں کٹ چکی ہیں۔ اور ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے نہ تو پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے۔ اس کو سمجھاؤ۔ کہ بھائی تیرے بچوں کو میں پال لوں گا۔ تو کیوں بلا میں پھنستا ہے۔"

ایک دفعہ مرزا غالب بہت قرضدار ہو گئے۔ قرض خواہوں نے نالش کر دی۔ جوابدہی میں طلب ہوئے۔ مفتی صاحب کی عدالت تھی جس وقت پیشی میں گئے۔ یہ شعر پڑھا۔

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

مرزا صاحب کو ایک آفت ناگہانی کے سبب سے چند روز جیل خانہ میں اسی طرح رہنا پڑا کہ جیسے حضرت یوسفؑ کو زندان مصر میں۔ کپڑے میلے ہو گئے۔ جوئیں پڑ گئیں تھیں۔ ایک دن بیٹھے ان میں سے جوئیں چن رہے تھے۔ ایک رئیس وہیں عیادت کو پہونچے۔ پوچھا کیا حال ہے۔ آپ نے یہ شعر پڑھا۔

ہم غمزدہ جس دن سے گرفتار بلا ہیں
کپڑوں میں جوئیں بخیوں کے ٹانکوں سے سوا ہیں

جس دن وہاں سے نکلنے لگے اور لباس تبدیل کرنے کا موقع آیا تو وہاں کا کرتہ وہیں پھاڑ کر پھینکا اور یہ شعر پڑھا۔

ہائے اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جسکی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

حسین علی خاں چھوٹا لڑکا ایک دن کھیلتا، کھیلتا آیا کہ دادا جان مٹھائی منگا دو۔ مرزا غالب نے فرمایا کہ پیسے نہیں۔ وہ صندوقچہ کھول کر ادھر اُدھر پیسے ٹٹولنے لگا۔ آپ نے فرمایا۔

دام و درم اپنے پاس کہاں
چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں

مرزا غالب کی قاطع برہان کے بہت شخصوں نے
جواب لکھے ہیں اور بہت زبان درازیاں کی ہیں۔ کسی
نے کہا کہ حضرت آپ نے فلاں شخص کی کتاب کا جواب
نہ لکھا۔ فرمایا بھائی! اگر کوئی گدھا تمہارے لات مارے تو تم اس
کا کیا جواب دو گے۔

بہن بیمار تھیں آپ عیادت کو گئے۔ پوچھا کیا حال ہے۔ وہ بولیں کہ مرتی ہوں قرض کی فکر ہے کہ گردن پہ لیے جاتی ہوں۔ آپ نے کہا کہ بوا۔ بھلا یہ کیا فکر ہے خدا کے ہاں کیا مفتی صدر الدین خاں بیٹھے ہیں جو ڈگری کر کے پکڑوا بلائیں گے۔

مرزا غالب کے ایک شاگرد رشید نے آکر کہا کہ حضرت آج میں امیر خسرو کی قبر پر گیا۔ مزار پر کھرنی کا درخت ہے۔ اس کی کھرنیاں میں نے خوب کھائیں۔ کھرنیوں کا کھانا تھا۔ کہ گویا فصاحت و بلاغت کا دروازہ کھل گیا۔ دیکھئے تو میں کیسا فصیح ہو گیا۔ مرزا نے کہا کہ ارے میاں تین کوس کیوں گئے۔ میرے پچھواڑے کے پیپل کی پیپلیاں کیوں نہ کھالیں۔ چودہ طبق روشن ہو جاتے۔

غدر کے چند روز بعد پنڈت موتی لعل کہ ان دنوں میں مترجم گورنمنٹ پنجاب کے تھے۔ صاحب چیف کمشنر پنجاب کے ساتھ دلی گئے۔ اور حب الوطن اور محبت فن کے سبب سے مرزا غالب صاحب سے ملاقات کی۔ ان دنوں میں پنشن بند تھی۔ دربار کی اجازت نہ تھی مرزا بہ سبب دل شکستگی کے شکوہ و شکایت سے لبریز ہو رہے تھے۔ اثنائے گفتگو میں کہنے لگے کہ عمر بھر ایک دن شراب نہ پی ہو تو کافر۔

اور ایک دفعہ بھی نماز پڑھی ہو تو مسلمان نہیں۔ پھر میں نہیں جانتا کہ مجھے سرکار نے باغی مسلمانوں میں کس طرح شامل سمجھا۔

بھوپال سے ایک شخص دلی کی سیر کو آئے۔ مرزا صاحب کے مشتاق ملاقات تھے۔ چنانچہ ایکدن ملنے کو تشریف لائے۔ وضع سے معلوم ہوتا تھا کہ نہایت پرہیزگار اور پارسا شخص ہیں۔ ان سے باکمال اخلاق پیش آئے
گلاس اور شراب کا شیشہ آگے رکھا تھا۔ ان بیچارہ کو خبر نہ تھی کہ آپ کو یہ شوق بھی ہے۔ انھوں نے کسی شربت کا شیشہ خیال کر کے ہاتھ میں اٹھا لیا کوئی شخص پاس سے بولا کہ جناب یہ شراب ہے۔ بھوپالی صاحب نے جھٹ شیشہ ہاتھ سے رکھ دیا۔ اور کہا کہ میں نے تو شربت کے دھوکے میں اٹھایا تھا۔
مرزا نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا اور فرمایا کہ نہ ہے نصیب دھوکے میں نجات ہو گئی۔

ایک مولوی صاحب جن کا مذہب سنّت جماعت تھا۔ رمضان کے دنوں میں مرزا غالب کی ملاقات کو آئے۔ عصر کی نماز ہو چکی تھی۔ مرزا نے خدمتگار سے پانی مانگا۔ مولوی صاحب نے کہا۔ حضرت غضب کرتے ہیں۔ رمضان میں روزے نہیں رکھتے۔ مرزا نے کہا۔ سنی مسلمان ہوں۔ چار گھڑی دن سے روزہ کھول لیا کرتا ہوں۔

رمضان کا مہینہ تھا۔ مرزا غالب نواب حسین مرزا کے ہاں بیٹھے تھے۔ پان منگا کر کھایا۔ ایک صاحب فرشتہ سیرت متقی و پرہیزگار اس وقت حاضر تھے۔ انھوں نے متعجب ہو کر پوچھا کہ قبلہ آپ روزہ نہیں رکھتے مسکرا کر بولے شیطان غالب ہے۔

جاڑے کا موسم تھا۔ ایک دن نواب مصطفےٰ خاں
صاحب مرزا کے گھر آ گئے۔ آپ نے ان کے آگے
شراب کا گلاس بھر کر رکھ دیا۔ وہ ان کا منہ دیکھنے لگے
آپ نے فرمایا لیجئے۔ چونکہ وہ تائب ہو چکے تھے انھوں
نے کہا کہ میں نے تو توبہ کر لی۔ آپ متعجب ہو کر بولے
کہ ہیں۔ جاڑے میں بھی؟

ایک صاحب نے ان کے سنانے کو کہا کہ شراب پینی سخت گناہ ہے آپ نے ہنس کر کہا کہ بھلا جو پیے تو کیا ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ادنیٰ بات یہ ہے کہ دعا نہیں قبول ہوتی۔

مرزا نے کہا کہ آپ جانتے ہیں شراب پیتا کون ہے اوّل تو وہ کہ ایک بوتل اولڈ ٹام کی باسامان سامنے حاضر ہو۔ دوسرے بے فکری۔ تیسرے صحت۔ آپ فرمایئے کہ جسے یہ سب کچھ حاصل ہو اسے اور چاہیے کیا۔ جس کیلئے دعا کرے۔

ذوق

محمد ابراہیم نام۔ ذوق تخلص ۱۷۸۹ء
میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ تمام
عمر وہیں رہے۔ ۱۸۵۴ء عیسوی میں
انتقال ہوا۔ بہادر شاہ ظفر شہزادگی کے زمانے
ہی سے ذوق کے شاگرد تھے۔

ابراہیم ذوقؔ

چڑیاں سایہ بان میں تنکے رکھ کر گھونسلا بنا رہی تھیں اور ان کے تنکے جو گرتے تھے انھیں لینے کو بار بار استاد شیخ ابراہیم ذوق کے آس پاس آ بیٹھتی تھیں۔ یہ عالم محویت میں بیٹھے تھے۔ ایک چڑیا سر پر آن بیٹھی۔ انھوں نے ہاتھ سے اڑا دیا۔ تھوڑی دیر میں پھر آن بیٹھی انھوں نے پھر اڑا دیا۔ جب کئی دفعہ ایسا ہوا۔ تو ہنس کر کہا کہ اس غیبانی نے میرے سر کو کبوتروں کی چھتری بنایا ہے۔ ایک طرف میں بیٹھا تھا۔ ایک طرف حافظ ویراں بیٹھے تھے "نابینا تھے۔ انھوں نے پوچھا کہ حضرت کیا؟ میں نے حال بیان کیا۔ ویراں بولے کے ہمارے سر پر تو نہیں بیٹھی۔ استاد نے کہا کہ بیٹھے کیونکر جانتی ہے کے یہ ملاّ ہے۔ عالم ہے حافظ ہے۔ ابھی اُحل لکم الصید کی آیت پڑھ کر کلو او اشربوا۔ بسم اللہ۔ اللہ اکبر کر دے گا۔ دیوانی ہے جو تمہارے پر آئے۔

شیخ مرحوم ضعفِ جسمانی کے سبب سے روزہ نہ رکھتے تھے۔ مگر اس پر بھی کسی کے سامنے کھاتے پیتے نہ تھے۔ کبھی دوا۔ یا شراب یا پانی بھی پینا ہوتا تو کوٹھے پر جاکر یا گھر میں جاکر پی آتے۔ ایک دفعہ پوچھا کہا میاں خدا کے گنہگار ہیں وہ عالمِ نہاں و آشکار کا ہے۔ اس کی تو شرم نہیں۔ بھلا بندے کی تو شرم رہے۔

رمضان کا مہینہ تھا۔ گرمی کی شدت۔ عصر کا وقت نوکر نے شربت نیلوفر کٹورے میں گھول کر کوٹھے پر تیار کیا۔ اور شیخ ذوق سے کہا کہ ذرا اوپر تشریف لے چلیئے۔ چونکہ وہ اس وقت کچھ لکھوا رہے تھے۔ مصروفیت کے سبب سے نہ سمجھے اور سبب پوچھا۔ اس نے اشارہ کیا۔ فرمایا لے آؤ یہیں یہ ہمارے یار ہیں۔ ان سے کیا چھپانا جب اس نے کٹورہ لاکر دیا۔ تو یہ مطلع کہا کہ فی البدیہ یہ واقع ہوا تھا۔

پلا مے آشکارا ہم کو کس کی ساقیا چوری
خدا کی جب نہیں چوری تو پھر بندے کی کیا چوری

آتش

خواجہ حیدر علی نام۔ آتش تخلص۔ دلّی کے
معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۷۷۸ء
فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ مصحفی کے
شاگرد تھے۔ ۱۸۴۸ء عیسوی میں لکھنؤ میں
انتقال ہوا۔

---

(۱)

ایک شاگرد اکثر بے روزگاری کی شکایت سے سفر کا ارادہ ظاہر کیا کرتے تھے اور خواجہ حیدرؔ علی آتش صاحب اپنی آزاد مزاجی سے کہا کرتے تھے۔ کہ میاں کہاں جاؤ گے۔ دو گھڑی مل بیٹھنے کو غنیمت سمجھو اور جو خدا دیتا ہے اس پر صبر کرو۔ ایک دن وہ آئے اور کہا کہ حضرت رخصت کو آیا ہوں۔ فرمایا خیر باشد کہاں؟ انھوں نے کہا کل بنارس کو روانہ ہوں گا کچھ فرمائش ہو تو فرما دیجیے۔ آپ ہنس کر بولے اتنا کام کرنا کہ وہاں کے خدا کو ذرا ہمارا بھی سلام کہہ دینا۔ وہ حیران ہو کر بولے کہ حضرت۔ یہاں اور وہاں کا خدا کوئی جدا ہے۔؟ فرمایا

کہ شاید یہاں کا خدا انجیل ہے۔ وہ کا کچھ سخی ہو۔ انھوں نے کہا معاذ اللہ معاذ اللہ آپ کے فرمانے کی یہ بات ہے؟ خواجہ صاحب نے کہا۔ بھلا سنو تو سہی جب خدا وہاں یہاں ایک ہے۔ تو پھر ہمیں کیوں چھوڑتے ہو۔ جس طرح وہاں جا کر مانگو گے۔ اسی طرح یہاں مانگو جو وہاں دے گا تو یہاں بھی دے گا۔

شاہ نصیر

نصیر الدین نام تھا۔ نصیرؔ تخلص۔ رنگت کے
سیاہ فام تھے۔ اس لیے گھرانے کے لوگ میاں
"کلو" کہتے تھے۔ وطن خاص دہلی تھا۔ آخر ایام حیدرآباد
دکن میں گزرے اور وہیں ۱۲۵۴ھ میں انتقال فرمایا۔
اور قاضی مخدوم موسٰی کی خانقاہ میں دفن ہوئے۔

(۱)

ایک دفعہ بھولو شاہ کو بسنت میں شاہ نصیر صاحب آئے چند شاگرد ساتھ تھے۔ انھیں لے کر تیس ہزاری باغ کی دیوار پر بیٹھے اور تماشا دیکھنے لگے۔ کسی رنڈی نے بہت سا روپیہ لگا کر نہایت زرق برق کے ساتھ ایک کارچوبی رتھ بنوائی تھی۔ شہر میں جاکر اس کا چرچا ہو رہا تھا۔ رنڈی رتھ میں بیٹھی چھم چھم کرتی سامنے سے نکلی۔ ایک شاگرد نے کہا کہ استاد اس پر کوئی شعر ہو اسی وقت فرمایا۔

اس کی رتھ کا کس طلائی دیکھ
شب کہا ماہ سے یہ پردیں نے
ہے بہ پرواز یہ نکالی ہے
چوچنج بیضہ سے مرغ زریں نے

ایک ایسی بے موقع پر کوئی رنڈی سامنے سے نکلی اس کے سر پر اودی رضائی تھی۔ اور دسمہ کی چپک عجیب لطف دکھاتی تھی۔ ایک شاگرد نے کہہ سر فرمائش کی انھوں نے فرمایا۔

اودی دسمہ کی نہیں تیری رضائی سر پر
مہ جبیں رات ہے تاروں بھری چھائی سر پر

(۲)

دلّی میں ایک منشی ہندو تھے۔ نجیا نام رنڈی پر مسلمان ہو گئے۔ شاہ نصیر صاحب نے فرمایا۔

جس طرف تو نے کیا ایک اشارہ نجیا
نجیا۔ تری چشم کا مارا نہ جیا

(۳)

دکن کی سرکار میں دستور تھا کہ دن رات برابر کاروبار جاری رہتے تھے۔ مختلف کاموں کے وقت مقرر تھے۔ جس صیغہ کا دربار ہو چکا۔ اس کے متعلق لوگ رخصت ہوئے۔ دوسرے صیغہ کے آن حاضر ہوئے اسی میں صاحب دربار نے اٹھ کر ذرا آرام لے لیا ضروریات سے فارغ ہوئے۔ اور پھر آن بیٹھے۔ چنانچہ مشاعرہ اور مناظرہ کا دربار رات کے پچھلے پہر ہوتا تھا۔ ایک موقع پر کہ نہایت دھوم دھام کا جلسہ تھا۔ تمام باکمال اہل دکن اور اکثر اہل ایران موجود تھے۔ سب کی طبیعتوں نے اپنے اپنے جوہر دکھائے خصوصاً چند شعرائے ایران نے ایسے ایسے قصائد سنائے کہ لب و دہن پہ حرف آفریں نہ چھوڑا۔ شاہ نصیر کی حسن رسائی اور اخلاق نے دربار کے چھوٹے بڑے سب تسخیر کر لیے تھے۔ چنانچہ شمع قریب پہنچی تو ایک خواص نے کہا کر نے کا عصا ہاتھ میں ہزار بارہ سو کا دوشالا کندھے پر ڈالے

کھڑا تھا. کان میں جھک کر کہا کہ آج آپ غزل نہ پڑھیں تو بہتر ہے. آپ وہیں بگڑ کے بولے کہ کیوں؟ اس نے کہا کہ ہوا تیز ہو گئی (یعنی کلام کا سر سبز ہونا مشکل ہے.) یہ خفگی سے ٹھوری پر ہاتھ پھیر کر بولے کہ ایسا تو میں خوبصورت بھی نہیں کہ کوئی صورت دیکھنے کو نوکر رکھے گا۔ یہ ہیں تو پھر میں ہوں کس کام کا۔ اس قیل و قال میں شمع بھی سامنے آگئی پھر جو غزل سنائی تو سب کو لٹا دیا۔

(۴)

ایک دن سلطان جی کی سترہویں میں شاہ نصیر گئے۔ اور باؤلی میں جاکر ایک طاق میں بیٹھ گئے۔ حقہ پی رہے تھے۔ کہ اتفاق ایک نواب صاحب آنکلے۔ شاہ صاحب سے صاحب سلامت ہوئی۔ وہیں بہت سی ارباب نشاط بھی حاضر تھیں۔ اور ناچ ہو رہا تھا۔ اس عالم زرق برق پر اشارہ کرکے نواب صاحب نے فرمایا کہ استاد۔ آج آپ بھی بالائے طاق ہیں۔ بولے جی ہاں جفت ہونے کو بیٹھا ہوں۔ آیئے تشریف لایئے۔

(۵)

ایک دن شاہ نصیر دکن کو چلے نواب جھجر مدّت سے بلاتے تھے اب چونکہ مقام مذکور سرِ راہ تھا اور گرمی شدت سے پڑتی تھی۔ برابر سفر بھی مشکل تھا۔ اس لیے وہاں گئے۔ اور کئی دن قیام کیا۔ جب چلنے لگے تو رخصت کی ملاقات کو گئے۔ نواب نے کہا کہ گرمی کے دن ہیں دکن کا سفر دور دراز کا سفر ہے خدا پھر خیر و عافیت سے لائے۔ مگر وعدہ فرمایئے۔ کہ اب جھجر میں کب آیئے گا۔ ہنس کر بولے کہ جھجر کی چاہ تو وہی گرمی میں۔

ناسخ

امام بخش نام۔ ناسخ تخلص ۱۷۸۰ء میں فیض آباد۔ میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ کو وطن بنایا۔ ۱۸۳۸ء میں لکھنؤ ہی میں انتقال ہوا۔

(۱)

شاہ غلام اعظم افضل شیخ ناسخ کے شاگرد اکثر حاضرِ خدمت ہوتے تھے۔ ایک دن آپ (ناسخ) تخت پر بیٹھے تھے اس پر سیتل پائی کا بوریہ بچھا تھا۔ افضل آئے۔ وہ بھی اسی پر بیٹھ گئے۔ اس پر سیتل پائی کا ایک تنکا توڑ کر چٹکی سے توڑنے اور مروڑنے لگے۔ شیخ صاحب نے آدمی کو بلا کر کہا کہ بھائی، وہ جو آج نئی جھاڑو تم بازار سے لائے ہو۔ ذرا لے آؤ۔ اس نے حاضر کی۔ خود لیکر شاہ صاحب کے سامنے رکھ دی اور کہا صاحبزادے! اس سے شغل فرمائیے۔ فقیر کا بوریا آپ کے تھوڑے سے التفات میں برباد ہو جائے گا پھر اور سیتل پائی اس شہر میں کہاں ڈھونڈھتا پھرےگا

وہ بیچارے شرمندہ ہو کر رہ گئے

(۲)

آغا کلب عابد خاں صاحب فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ شیخ ناسخ صاحب کے واسطے کسی شخص نے دو تین چمچے بطریق تحفہ بھیجے جو شیشے کے تھے۔ ان دنوں میں نیا ایجاد سمجھے جاتے تھے۔ اور حقیقت میں بہت خوشنما تھے۔ درِ پہلو میں طاق پر رکھے تھے۔ ایک امیر صاحبزادے آئے اس طرف دیکھا اور پوچھا کہ حضرت یہ چمچے کہاں سے خریدے اور کس قیمت کو خریدے۔ شیخ صاحب نے حال بیان کیا۔ انھوں نے ہاتھ بڑھا کر ایک چمچہ اٹھا لیا۔ دیکھ کر تعریف کی۔ پھر باتیں چیتیں کرتے رہے۔ اور چمچہ سے زمین پر کھٹکا دے کر شغل بے شغلی فرماتے رہے۔ شیشہ کی بساط کیا تھی۔ ٹھیس زیادہ لگی جھٹ سے دو ٹکڑے۔ شیخ صاحب نے دوسرا چمچہ اٹھا کر سامنے رکھ دیا۔ اور کہا اب اس سے شغل فرمائیے

ایک دن اپنے خانہ باغ کے بنگلہ میں شیخ ناسخ
بیٹھے تھے۔ اور فکر مضموں میں عرق تھے۔ ایک شخص آ کر
بیٹھے۔ ان کی طبیعت پریشان ہوئی۔ اٹھ کر ٹہلنے لگے کہ
یہ اٹھ جائیں۔ ناچار پھر آ بیٹھے۔ مگر وہ نہ اٹھے۔ کسی ضرورت
کے بہانے سے پھر گئے کہ یہ سمجھ جائیں گے۔ وہ پھر بھی
نہ سمجھے۔ انھوں نے چلم میں سے چنگاری اٹھا کر بنگلہ کی ٹٹی میں
رکھ دی اور آپ لکھنے لگے۔ ٹٹی جلنی شروع ہوئی
وہ شخص گھبرا کر اٹھے اور کہا شیخ صاحب آپ دیکھتے
کیا ہیں۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ انھوں نے ان کا ہاتھ پکڑ
لیا کہ جاتے کہاں ہو۔ اب تو مجھے اور تمہیں مل کر راکھ کا
ڈھیر ہونا ہے۔ تم نے میرے مضامین کو خاک میں ملا یا
ہے۔ میرے دل کو جلا کر خاک کیا ہے۔ اب کیا تمہیں
جانے دوں گا۔

اسی طرح ایک شخص نے بیٹھ کر انھیں تنگ کیا
نوکر کو بلا کر صندوقچہ منگایا اس میں سے مکان کے
قبالے نکال کر ان کے سامنے دھر دیئے۔ اور نوکر سے
کہا کہ بھائی مزدوروں کو بلاؤ۔ اور اسباب اٹھا کر لے
چلو۔ ادھر وہ شخص حیران ان کا منھ دیکھے ادھر نوکر
حیران۔ آپ نے کہا دیکھتے کیا ہو مکان پر تو یہ قبضہ
کر چکے ایسا نہ ہو کہ اسباب بھی ہاتھ سے جاتا رہے

(۵)

میر گھسیٹا ایک شخص مر گئے تو شیخ صاحب نے تاریخ فرمائی۔

جب مر گئے ہائے میر گھسیٹا
ہر ایک نے اپنے منہ کو پیٹا
ناسخ نے کہی یہ سن کے تاریخ
افسوس کی موت نے گھسیٹا

ایک مشاعرہ میں ناسخ ایسے وقت پہنچے کہ جلسہ ختم ہو چکا تھا۔ مگر خواجہ حیدر علی آتش وغیرہ چند شعراء ابھی موجود تھے۔ یہ جاکر بیٹھے۔ تعظیم رسمی اور مزاج پرسی کے بعد کہا کہ جناب خواجہ صاحب مشاعرہ ہو چکا انھوں نے کہا کہ سب کو آپ کا اشتیاق رہا۔ شیخ صاحب نے یہ مطلع پڑھا۔

جو خاص ہیں وہ شریک گروہ عام نہیں
شمار دانۂ تسبیح میں امام نہیں

چونکہ نام امام بخش تھا۔ اسلیئے تمام اہل جلسہ نے نہایت تعریف کی۔

شیخ مصحفی

شیخ غلام ہمدانی نام۔ مصحفی تخلص ۱۷۵۰ء میں بمقام امروہہ ضلع مراد آباد پیدا ہوئے۔ دوسرے شعراء کی طرح یہ بھی دلی کو خیرباد کہہ کر نواب آصف الدولہ کے زمانے ۱۷۷۳ء میں لکھنو گئے لیکن دلی کی یاد انھیں ہمیشہ ستاتی رہی ۱۸۳۲ء میں لکھنؤ میں انتقال کیا۔

(۱)

شیخ مصحفی کے شاگردوں میں منتظر اور گرم دو بڑے چلتے طپنچے تھے۔ وہ نواب صاحب کی سرکار میں توپخانہ وغیرہ کی خدمت رکھتے تھے۔ انھوں نے زبان سے تدبیروں سے معرکوں سے استادی کے مورچے باندھے ایک مثنوی لکھ کر گرم طمانچہ نام رکھا۔ میر انشاء اللہ خاں نے جب مشاعرہ میں گردن کی غزل پڑھی اور اس میں یہ شعر پڑھا۔

آئینہ کی گر سیر کرے شیخ تو دیکھے
سر خرہ کا منھ خوک کا لنگور کی گردن

مقطع میں بلعم باعور کا اشارہ بھی ان کی کہن سالی پر چوٹ کرتا ہے۔ کیونکہ وہ حضرت موسیٰ کے عہد میں ایک عابد تھا ریاضت جو بڑھاپے اور ریاضت سے اس قدر تحلیل ہو گیا تھا کہ شاگرد پوٹلی میں باندھ کر کبھی بغل میں مارے پھرتے تھے کبھی کندھے پر ڈال لیتے تھے اور جہاں چاہتے تھے لے جاتے تھے۔ منتظر بھی اپنی غزل میں سید موصوف پر

چوٹیں کیں۔ ان میں سے ایک مصرعہ یاد ہے۔

باندھی دمِ لنگور میں لنگور کی گردن

کیونکہ سید انشاء اکثر دوپٹہ گلے میں ڈالے رہتے تھے۔
اس طرح کہ ایک سرا آگے اور دوسرا سرا پیچھے پڑا رہتا
تھا۔ چنانچہ سید انشاء نے اسی وقت ایک شعر اور کہا۔

سفر پر ظرافت کے ذرا شیخ کو دیکھو
سرخوں کا منہ پیاز کا اچور کی گردن

بڈھے بے چارہ کا سر بھی سفید تھا۔ گوری رنگت بڑھاپے
میں خون جم کر سرخ ہو گیا تھا۔

(۲)

سید انشاء کی طبیعت کی شوخی اور زبان کی بے باکی محتاج بیان نہیں۔ چنانچہ بہت سی زٹل اور فحش ہجوئیں کہیں کہ جن کا ایک ایک مصرع ہزار فہمی اور چابک کا طراقا تھا۔ بڈھا مصحفی بے چارہ ابھی اپنی شیخی کی جریب اور اعصائے عزور کے سہارے سے کھڑا ہو کر جتنا کمر میں بوتا تھا مقابلہ کرتا رہا۔ جب نوبت حد سے گزر گئی تو اس کے شاگردوں سے بھی لکھنؤ بھرا پڑا تھا۔ منتظر اور گرم سب کو لے کر اٹھ کھڑے ہوئے اور جو کچھ ہو سکا شاگردی کا حق ادا کیا۔ ایک دن سب اکٹھے ہوئے شہدوں کا سوانگ بھرا اور ایک ہجو کہہ کر اس کے اشعار پڑھتے ہوئے سید انشاء کی طرف روانہ ہوئے اور مستعد تھے کہ زد و کشت سے بھی دریغ نہ ہو۔ سید انشاء کو ایک دن پہلے خبر لگ گئی۔ اب ان کی طبع رنگین کی شوخی دیکھیے کہ مکان کو فرش فروش جھاڑ فانوس سے سجایا۔ اور امرائے شہر اور اپنے یاروں کو بلایا۔ بہت سی شیرینی منگا کر خوان لگائے۔ کشتیوں میں گلوریاں۔

چنگروں میں پھولوں کے ہار سب تیار کیئے۔ جب سنا کہ حریف کا مجمع قریب آپہونچا۔ اس وقت یہاں سے سب کو لے کر استقبال کو چلے۔ ساتھ خود تعریفیں کرتے۔ سبحان اللہ واہ وا سے داد دیتے اپنے مکان پر لائے۔ سب کو بٹھایا۔ اور خود دوبارہ پڑھوایا۔ آپ بھی بہت اچھلے کودے شیرینیاں کھلائیں شربت پلائے۔ پان کھلائے۔ ہار پہنائے۔ ہنس بول کر عزت و احترام سے رخصت کیا۔

لیکن سید انشاء نے جو اس کا جواب حاضر کیا وہ قیامت تھی ایک انبوہ کثیر برات کے سامان سے ترتیب دیا۔ اور عجیب و غریب ہجوئیں تیار کر کے لوگوں کو دیں۔ کچھ ڈنڈوں پر پڑھتے جاتے تھے۔ کچھ ہاتھیوں پر بیٹھے تھے۔ ایک ہاتھ میں گڈا۔ ایک میں گڑیا۔ دونوں کو لڑاتے تھے۔ زبانی ہجو پڑھتے جاتے تھے۔ جس کا ایک شعر یہ ہے۔

سوانگ نیا لایا ہے دیکھنا چرخ کہن
لڑتے ہوئے آئے ہیں مصحفی و مصحفن

انشاء

سید انشاء اللہ خاں نام۔ انشاؔ تخلص ۱۷۵۶ء
اور ۱۷۵۸ء کے درمیان مرشد آباد میں پیدا
ہوئے۔ مرشد آباد سے دلّی آئے اور شاہ عالم
ثانی کے درباریوں میں جگہ پائی۔ ۱۷۹۱ء میں لکھنؤ
گئے۔ سعادت علی خاں کے دربار میں جگہ پائی
۱۸۱۷ عیسوی میں لکھنؤ میں وفات پائی۔

(۱)

نواب سعادت علی خاں نواڑے میں لیٹے ہوئے میر انشاء اللہ خاں کی گود میں سر دھرا ہوا اسرور کے عالم میں دریا کی سیر کرتے چلے جاتے تھے۔ لب دریا ایک حویلی پر لکھا دیکھا حویلی علی نقی بہادر کی۔ کہا کہ انشاء دیکھو۔ کسی نے تاریخ کہی مگر نظم نہ کر سکا۔ بھبتی تم نے دیکھا بہت خوب مادہ ہے۔ اسے رُباعی کر دو۔ اسی وقت عرض کی ؎

نہ عربی نہ فارسی نہ ترکی — نہ سم کی نہ تال کی نہ سر کی
یہ تاریخ کہی ہے کسی لڑکی — حویلی علی نقی خاں بہادر کی

(۲)

ایک دن نواب صاحب کے ساتھ بیٹھے میر انشاء کھانا کھا رہے تھے۔ اور گرمی سے گھبرا کر دستار سر سے رکھ دی تھی۔ منڈا ہوا سر دیکھ کر نواب کی طبیعت میں چہل آئی۔ ہاتھ بڑھا کر پیچھے سے ایک دھول ماری۔ آپ نے جلدی سے ٹوپی سر پر رکھ لی۔ اور کہا سبحان اللہ بچپن میں بزرگ سمجھایا کرتے تھے وہ بات سچ ہے کہ ننگے سر کھانا کھاتے ہیں تو شیطان دھولیں مارا کرتا ہے۔

(۳)

ایک دن نواب نے روزہ رکھا اور حکم دیا۔ کوئی آنے نہ پائے۔ سید انشاء کو ضروری کام تھا۔ یہ پہونچے پہرہ دار نے کہا کہ آج حکم نہیں۔ آگے آپ مالک ہیں باوجود انتہائے مرحمت کے یہ بھی مزاج سے ہشیار رہتے تھے۔ تھوڑی دیر تامل کیا۔ آخر کمر کھول دستار سر سے بڑھا قبا اتار ڈالی اور دوپٹہ عورتوں کی طرح سے اوڑھ کر ایک نازو انداز کے ساتھ سامنے جاکر کھڑے ہوئے۔ جونہی ان کی نظر پڑی۔ آپ انگلی ناک پر دھر کر بولے۔

میں ترے صدقے نہ رکھ اے مری پیاری روزہ
بندی رکھ لے گی ترے بدلے ہزاری روزہ

نواب بے اختیار ہنس پڑے۔ جو کچھ کہنا سننا تھا۔ وہ کہا۔ اور ہنستے کھیلتے چلے آئے

(۴)

ایک دن کسی جلسہ میں کچھ ایسا تذکرہ آیا کہ سعادت علیخاں نے کہا۔ ہجر بالفتح بھی درست ہے۔ جان بیلی صاحب نے کہا خلاف محاورہ ہے۔ سعادت علی خاں بولے کہ خیر لغت کے اعتبار سے جب درست ہے تو استعمال میں کیا مضائقہ اتنے میں سید انشاء آ گئے۔ جان بیلی صاحب نے کہا کہ کیوں سید انشاء ہجر اور ہجر میں تم کیا کہتے ہو۔ انھیں یہاں کی خبر نہ تھی۔ بے ساختہ کہہ بیٹھے کہ ہجر بالکسر! مگر سعادت علی خاں کی تیوری تاڑ گئے اور فوراً بولے کہ حضور جب ہی تو جامی فرماتے ہیں۔

شب وصل است و طے شد نامۂ ہجر
سلامٌ ہِیَ حتیٰ مطلع الفجر

یہ سنتے ہی سعادت علی خاں شگفتہ ہو گئے اور اہل دربار ہنس پڑے

(۵)

ایک دن سرِ دربار بعض شرفائے خاندانی کی شرافت نجابت کے تذکرہ ہو رہے تھے۔ سعادت علی خاں نے کہا کہ کیوں بھئی ہم بھی نجیب الطرفین ہیں۔ اسے اتفاق تقدیر کہو یا زیادہ گوئی کا ثمرہ سمجھو سید انشاء بول اٹھے کہ حضور بلکہ انجب سعادت علی خاں حرم شکم سے تھے۔ وہ چپ اور تمام دربار درہم برہم ہو گیا۔ اگرچہ انھوں نے اور باتیں بنا بنا کر بات کو مٹانا چاہا۔ مگر کمان تقدیر سے تیر نکل چکا تھا۔

میر تقی میر

محمد تقی نام۔ میر تخلص ۱۷۲۲ء میں اکبرآباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے۔ نواب آصف الدولہ کی دعوت پر ۱۷۸۲ء میں لکھنؤ گئے۔ اور وہیں ۱۸۱۰ء میں لکھنؤ میں وفات پائی۔

(۱۱)

لکھنؤ میں کسی نے میر تقی میرؔ سے پوچھا کیوں حضرت
آج کل شاعر کون ہے کہا ایک تو سودا۔ دوسرا خاکسار
ہے۔ اور تامل کرکے کہا۔ آدھے خواجہ میر درد۔ کوئی
شخص بولا کہ حضرت اور میر سوز صاحب؟ چیں بجبیں
ہو کر کہا کہ میر سوز صاحب بھی شاعر ہیں؟ انھوں نے
کہا کہ آخر استاد نواب آصف الدولہ کے ہیں۔ کہا کہ
خیر یہ ہے تو پونے تین سہی مگر شرفا میں ایسے تخلص
ہم نے کبھی نہیں سنے۔ میر صاحب کے سامنے مجال
کس کی تھی جو کہے کہ ان بیچارے نے میر تخلص کیا تھا
وہ آپ نے چھین لیا۔ ناچار اب انھوں نے ایسا تخلص
اختیار کیا کہ نہ آپ کو پسند آئے نہ آپ اسے چھینیں

جرأت

شیخ قلندر بخش مشہور۔ جراءت تخلص۔ اصلی نام یحییٰ امان تھا۔ والد خاص دلّی کے رہنے والے تھے۔ ۱۲۱۵ھ میں لکھنؤ پہونچے اور آخر عمر تک وہیں رہے ۱۲۲۵ء میں وفات پائی۔

میاں جرأت کے حال میں۔ بلکہ ساری کتاب میں افسوس کی بات تو یہ ہے کہ عین جوانی میں آنکھوں سے معذور ہو گئے۔ بعض کہتے ہیں کہ حادثہ چیچک سے ہوا۔ استاد مرحوم نے ایک دفعہ فرمایا کہ بھئی زمانہ کی دو آنکھیں ہیں۔ نیکی کی آنکھ نے ان کے کمال کو بڑی قدردانی سے دیکھا۔ بدی کی آنکھ نہ دیکھ سکی۔

(۲)

کریلا۔ ایک برا تم بھانڈ دلّی کا رہنے والا۔ نواب شجاع الدولہ کے ساتھ گیا تھا۔ اور اپنے فن میں صاحب کمال تھا۔ ایک دن کسی محفل میں اس کا طائفہ حاضر تھا۔ شیخ جرأت بھی وہاں موجود تھے۔ اس نے نقل کی۔ ایک ہاتھ میں لکڑی لے کر دوسرا ہاتھ اندھوں کیطرح بڑھایا۔ ٹٹول ٹٹول کر پھرنے لگا۔ اور کہنے لگا کہ حضور شاعر بھی اندھا شعر بھی اندھا۔

صنم سنتے ہیں تیرے بھی کمر ہے،
کہاں ہے کس طرف کو ہے کدھر ہے

شیخ صاحب خفا ہوئے۔ مگر یہ بھی سید انشاء اور میرزا قتیل کے جتھے کے جز اعظم تھے۔ گھبرا کر انھوں نے اس کی ہجو کہہ دی اور خاک خوب اڑائی۔ اسے سن کر کریلا بہت کڑوا یا۔ چنانچہ دوسرے جلسہ میں پھر اندھے کی نقل کی۔ اسی طرح لاٹھی لے کر پھرنے لگا۔ ان کی ایک غزل ہے۔

امشب تری زلفوں کی حکایات ہے واللہ

کیا رات ہے کیا رات ہے، کیا رات ہے واللہ

ہر ایک رات کے لفظ پر لکڑی کا سہارا بدلتا تھا۔

"کیا رات ہے کیا رات ہے کیا رات ہے واللہ" اس غزل کے ہر شعر کا دوسرا مصرع۔ ایک ہی ڈھنگ پر ہے چنانچہ ساری غزل کو اسی طرح محفل میں پڑھتا پھرا۔ شیخ صاحب اور بھی غصہ ہوئے اور پھر آکر ایک ہجو کہی ترجیع بند تھا۔ ؎

اگلا جھولے بگلا جھولے ساون ماس کریلا پھولے

اس کو بھی خبر ہوئی بہت کھا۔ پھر کسی محفل میں ایک زچہ کا سوانگ بھرا۔ اور ظاہر کیا کہ اس کے پیٹ میں بھتنا گھس گیا۔ ہے۔ خود ملّا بن کر بیٹھا۔ اور جس طرح جنات اور سیانوں میں لڑائی ہوتی ہے۔ اسی طرح جھگڑتے جھگڑتے بولا کہ ارے نامراد کیوں غریب ماں کی جان کا لاگو ہوا ہے جرأت ہے تو باہر نکل آکہ ابھی جلا کر خاک کردوں۔

(۳)

ایک دن سید انشاء اللہ خاں جرأت کی ملاقات کو آئے دیکھا تو سر جھکائے بیٹھے کچھ سوچ رہے ہیں۔ انھوں نے پوچھا کس فکر میں بیٹھے ہو۔ جرأت نے کہا کہ ایک مصرع خیال میں آیا ہے چاہتا ہوں کہ مطلع ہو جائے۔ انھوں نے پوچھا کیا ہے؟ جرأت نے کہا کہ خوب مصرع ہے مگر جب تک دوسرا مصرع نہ ہوگا تب تک نہ سناؤں گا۔ نہیں تو تم مصرعہ لگا کر اسے بھی چھین لوگے۔

سید انشاء نے بہت اصرار کیا۔ آخر جرأت نے پڑھ دیا۔

اس زلف پہ پھبتی شب دیجور کی سوجھی

سید انشاء نے فوراً کہا کہ۔ ع

اندھے کو اندھیرے میں بہت دور کی سوجھی

جرأت ہنس پڑے اور اپنی لکڑی اٹھا کر مارنے دوڑے دیر تک سید انشاء آگے آگے بھاگے پھرے اور پیچھے پیچھے ٹٹولتے پھرے۔

(۴)

نواب محبت خاں کے مختار نے ایک دفعہ جاڑے میں معمولی پوشاک دینے میں کچھ دیر کی۔ جرأت نے رباعی کہہ کر کھڑے کھڑے خلعت حاصل کرلیا۔

مختاری پہ آپ نہ کیجیے گا گھمنڈ
کہتے ہیں جسے نوکری ہے بیخ ارنڈ
سرائی دلا دیجئے ہماری ورنہ
تم کھاؤ گے گالیاں جو ہم کھائینگے ٹھنڈ

میر درد

خواجہ میر نام درد تخلص ۱۷۲۰ء میں بمقام دہلی میں پیدا ہوئے۔ جب دلی پہ تباہی آئی اور شعر و سخن کا مرکز لکھنؤ میں منتقل ہوا۔ اس وقت بھی خواجہ صاحب استقلال میں فرق نہ آیا۔ ۱۷۸۴ء میں دلی ہی میں انتقال کیا۔

(۱)

میر درد کا معمول تھا کہ ہر مہینے کی دوسری اور ۲۴ کو شہر کے بڑے بڑے کلاونت۔ دوم۔ گویئے۔ اور صاحب کمال اہل ذوق خواجہ میر درد کے یہاں جمع ہوتے تھے اور معرفت کی چیزیں گاتے تھے۔ یہ دن ان کے کسی بزرگ کی وفات کے ہیں۔ محرم غم کا مہینہ ہے۔ اس میں ۲ کو بجائے گانے کے مرثیہ خوانی ہوتی تھی۔ مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب کا گھرانا اور یہ خاندان ایک محلہ میں رہتے تھے۔ ان کے والد مرحوم کے زمانہ میں شاہ صاحب عالم طفولیت میں تھے۔ ایک دن اس جلسہ میں چلے گئے۔ اور خواجہ صاحب کے پاس جا بیٹھے۔ ان کی مزید بہت سی کنچنیاں بھی تھیں اور چونکہ اس وقت رخصت ہوا چاہتی تھیں اس لیے سب سامنے حاضر تھیں باوجودیکہ مولوی صاحب اس وقت بچہ تھے۔ مگر ان کا تبسّم اور طرز نظر دیکھ کر خواجہ صاحب اعتراض کو پا گئے۔ اور کہا کہ فقیر کے نزدیک تو یہ سب ماں بہنیں ہیں۔ مولوی صاحب نے کہا کہ ماں بہنوں کو عوام الناس میں لے کر بیٹھنا کیا مناسب ہے خواجہ صاحب خاموش

رہے۔

ان کے یہاں ایک صحبت خاص ہوتی تھی۔ اس خواجہ میر درد صاحب نالہ عندلیب یعنی اپنے والد کی تصنیفات اور اپنے کلام کچھ کچھ بیان کرتے تھے۔ ایک دن مرزا رفیع سے سر راہ ملاقات ہوئی۔ خواجہ صاحب نے تشریف لانے کے لیے فرمائش کی۔ مرزا صاحب نے کہا۔ صاحب مجھے یہ نہیں بھاتا کہ کوّے کائیں کائیں کریں۔ اور بیچ میں ایک پدّا بیٹھ کر چوں چوں کرے۔ اس زمانے کے بزرگ ایسے صاحب کمالوں کی بات کا تحمّل اور برداشت کرنا لازم بزرگ سمجھتے تھے۔ اور کہتے کہ چپکے ہو رہے۔

سوز

محمد میر نام۔ سوز تخلص۔ پرانی دلی میں قرادل پورہ محلہ میں رہتے تھے۔ مگر اصل وطن بزرگوں کا نجارا تھا۔ شاہ عالم بادشاہ کے زمانہ میں ۱۱۹۱ھ میں دہلی چھوڑ کر لکھنؤ آئے۔ اور ۱۲۱۳ ہجری میں شہر لکھنؤ میں ۷۰ برس کی عمر میں فوت ہوئے۔

(۱)

کسی شخص نے میر سوز سے آکر کہا کہ حضرت ایک شخص آپ کے تخلص پر آج ہنستے تھے۔ اور کہتے تھے کہ سوز گوز کیا تخلص رکھا ہے۔ ہمیں پسند نہیں۔ انھوں نے کہنے والے کا نام پوچھا۔ اس نے بعد بہت سے انکار اور اصرار کے بتایا معلوم ہوا کہ شخص موصوف بھی مشاعرہ میں ہمیشہ آتے ہیں۔ میر سوز مرحوم نے کہا خیر کچھ مضائقہ نہیں۔ اب کی صحبت کے مشاعرہ میں تم مجھ سے برسرِ جلسہ یہی سوال کرنا۔ چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا اور بآوازِ بلند پوچھا آپ کا تخلص کیا ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ صاحب قبلہ فقیر نے تخلص تو میر کیا تھا۔ مگر وہ میر تقی صاحب نے پسند فرمایا۔ فقیر نے خیال کیا کہ ان کے کمال کے سامنے میرا نام نہ روشن ہو سکے گا۔ ناچار سوز تخلص کیا۔ شخص مذکور کی طرف اشارہ کر کے کہا، سنتا ہوں یہ صاحب گوز کرتے ہیں۔

سودا

میرزا محمد رفیع نام۔ سودا تخلص سنہ ۱۷۱۳ء میں دلّی میں پیدا ہوئے۔ نواب شجاع الدولہ کے طلب کرنے پر فیض آباد گئے۔ نواب آصف الدولہ کے ہمراہ فیض آباد سے لکھنؤ آئے اور وہیں سنہ ۱۷۸۰ء میں انتقال کیا۔

(۱)

مرزا سودا کے کلام کا شہرہ عالمگیر ہوا تو شاہ عالم بادشاہ اپنا کلام اصلاح کے لیے دینے لگے اور فرمائشیں کرنے لگے ایک دن کسی غزل کے لیے تقاضہ کیا۔ انھوں نے عذر بیان کیا۔ حضور نے فرمایا بھئی مرزا کے غزلیں روز کہہ لیتے ہو۔؟ مرزا نے کہا پیر مرشد جب طبیعت لگ جاتی ہے دو چار شعر کہہ لیتا ہوں۔ حضور نے فرمایا بھئی ہم تو پاخانہ میں بیٹھے، بیٹھے چار غزلیں کہہ لیتے ہیں۔ ہاتھ باندھ کر عرض کیا۔ حضور۔ ویسی بو بھی آتی ہے

(۲)

آصف الدولہ ایک دفعہ شکار کو گئے۔ خبر آئی کہ نواب نے بھیلوں کے جنگل میں شیر مارا۔ باوجودیکہ مرزا سودا ہمیشہ انعام واکرام کے انباروں سے زیر بار تھے مگر فوراً کہا۔

یارو یہ ابن ملجم پیدا ہوا دوبارہ — شیر خدا کو جس نے بھیلوں کے بن میں مارا۔ نواب کو خبر ہوئی۔ جب پھر کر آئے تو خود شکایت دوستانہ کے طور پر کہا۔ کہ مرزا تم نے ہم کو شیر خدا کا قاتل بنایا؟ ہنس کر کہا کہ جناب عالی۔ شیر تو اللہ ہی کا تھا نہ حضور کا نہ فدوی کا

شیخ قائم علی ساکن اٹاوہ ایک طباع شاعر تھے۔ کمال اشتیاق سے مقبول نبی خاں انعام اللہ خاں یقین کے بیٹے کے ساتھ بہ ارادۂ شاگردی مرزا سودا کے پاس آئے۔ اور اپنے اشعار سنائے آپ نے پوچھا تخلص کیا ہے۔ کہا امیدوار سکرلے اور فرمایا ؎

ہے فیض سے کسی کے شجر ان کا باردار
اس واسطے کیا ہے تخلص امیدوار

بیچارے شرمندہ ہو کر چلے گئے۔ قائم تخلص کیا۔

ایک دن میاں ہدایت مرزا سودا کی ملاقات کو آئے۔ بعد رسوم معمولی کے آپ نے پوچھا کہ فرمایئے میاں صاحب آجکل کیا شغل رہتا ہے انھوں نے کہا افکار دنیا فرصت نہیں دیتے طبیعت کو ایک مرض یادہ گوئی کا لگا ہوا ہے۔ گاہے ماہے غزل کا اتفاق ہو جاتا ہے۔ مرزا ہنس کر بولے کہ غزل کیا کہنا کوئی ہجو کہا کیجیے۔ بیچارے نے حیران ہو کر کہا کہ ہجو کس کی کہوں؟ آپ نے کہا ہجو کی کیا چاہتے تم میری ہجو کہو میں تمہاری ہجو کہوں

(۵)

سید انشاؔ کا عالم نوجوانی تھا۔ مشاعرہ میں غزل پڑھی۔

جھڑکی سہی ادا سہی چینِ جبیں سہی
سب کچھ سہی پر ایک نہیں کی نہیں سہی

جب یہ شعر پڑھا کہ ؎

گر نازنیں کہے سے برا مانتے ہو تم
میری طرف تو دیکھئے میں نازنیں سہی

سوداؔ کا عالم پیری تھا۔ مشاعرہ میں موجود تھے مسکرا کر بولے "دریں چہ شک"

امیر خسرو

ابو الحسن نام۔ خسرو تخلص ۱۲۵۳ء میں مقام پٹیالی (صوبہ آگرہ) پیدا ہوئے۔ ملس سے محمد تغلق تک گیارہ بادشاہوں کا زمانہ دیکھا ۱۳۲۴ء میں انتقال ہوا۔

(۱)

امیر خسرو ایک مجرب نسخہ آنکھوں کا دوہروں کی بحر میں کہتے ہیں ؎

لودھ پھٹکری مردہ سنگ ہلدی زیرہ ایک ایک ٹنگ
افیون چنا بھر مرچیں چار اُرد برابر تھوتھا ڈار
پوست کے پانی پوٹلی کرے ترت پیر نینوں کی ہرے

(۲)

بڑے آغا کو پنشن لینے کل کچہری گیا تھا۔ ڈپٹی صاحب کرے کے آگے کچھ قرقی کا مال نیلام ہو رہا تھا۔ کرسیاں کوٹ اور واسکٹیں نئی تھیں۔ گنٹر اور گلاس بھی ولایتی تھے کرسیاں۔ میزیں۔ چقیں بارک خوش رنگ تھیں۔ میں نے کہا چلو کوئی ڈھب کی چیز ہو تو لے لیں۔ منجھلے آغا بولے جانے بھی دو۔ جب مال نے مالک سے وفا نہ کی ہم سے کیا وفا کرے گا۔

(۳)

سلطان جی صاحب کے یہاں ایک سیاح فقیر مہمان آئے۔ رات کو دسترخوان پر بیٹھے۔ کھانے کے بعد باتیں شروع ہوئیں۔ سیاح نے ایسے دفتر کھولے کہ بہت رات گئی ختم ہی نہ ہوں۔ سلطان جی صاحب نے کچھ انگڑائیاں کچھ جمائیاں بھی لیں۔ وہ سادہ لوح کسی طرح بھی نہ سمجھے۔ سلطان جی صاحب مہمان کی دل شکنی سمجھ کر کچھ نہ کہہ سکے۔ مجبور بیٹھے رہے۔ امیر خسرو بھی موجود تھے۔ مگر بول نہ سکتے تھے کہ آدھی رات کو نوبت بجی۔ اس وقت سلطان جی نے کہا کہ خسرو یہ کیا بجا عرض کی آدھی رات کی نوبت ہے۔ پوچھا اس میں کیا آواز آتی ہے؟ انھوں نے کہا سمجھ میں تو ایسا آتا ہے

نان کر خوردی خانہ برو، نان کر خوردی خانہ برو، خانہ برو خانہ برو، خانہ برو، نان کر خوردی خانہ برو، نہ کہ بدست تو گردم خانہ گرو، خانہ برو، خانہ برو، حرف حرف کی حرکت وسکون پر خیال کرو۔ ایک ایک چوٹ کو کیا پورا پورا ادا کر رہے ہیں۔ اور نہ بدست کردم خانہ گرو کو دیکھو اس نے کیا کام کیا۔

فغاںؔ

اشرف خاں نام۔ فغاںؔ تخلص احمد شاہ بادشاہ کے کوکا تھے۔ لطیفہ گوئی کا یہ عالم تھا کہ زبان سے پھول جھڑتے تھے۔ ۱۱۸۶ھ میں عظیم آباد میں وفات پائی۔

(۱)

ایک دن فغاں نے راجہ شتاب رائے کے دربار میں غزل پڑھی جس کا قافیہ لالیاں اور جالیاں سب سخن فہموں نے بہت تعریف کی۔ راجہ صاحب کی صحبت میں جگنو میاں ایک مسخرے تھے۔ ان کی زبان سے نکلا کہ نواب صاحب سب قافیہ آپ نے باندھے مگر تالیاں رہ گئیں۔ انھوں نے ٹال دیا۔ اور کچھ جواب نہ دیا۔ راجہ صاحب نے خود فرمایا کہ نواب صاحب! سنتے ہو جگنو میاں کیا کہتے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ مہاراج اس قافیہ کو مبتذل سمجھ کر چھوڑ دیا تھا اور حضور فرمائیں تو اب بھی ہو سکتا ہے مہاراج نے کہا ہاں کچھ کہنا تو چاہیے انھوں نے اسی وقت پڑھا۔

جگنو میاں کی دم جو چمکتی ہے رات کو
سب دیکھ دیکھ اس کو بجاتے ہیں تالیاں

تمام دربار چمک اٹھا اور میاں جگنو مدھم ہو کر رہ گئے۔

7/9/07.